بسلسلہ برقی اشاعت الاحسان اکیڈمی بہرائچ ۵

قصۂ چہار درویش

پروفیسر طاہر محمود

سلسلہ ترقی اشاعت الاحسان اکیڈمی بہرائچ ۵

قصہ چہار درویش

مصنف: پروفیسر طاہر محمود

سیٹنگ: جنید احمد نور

صفحات: ۱۰

سن اشاعت: جولائی ۲۰۲۱ء

نوعیت اشاعت: آن لائن

ناشر: الاحسان اکیڈمی بہرائچ

Qissa Chahar Darvesh

By: Prof. Tahir Mahmood

Edition: July 2021
Pages: 10
Setting: Juned Ahmad Noor
Mode of Publication: Online
Publisher: Al-Ehsan Academy Bahraich

قصّۂ چہار درویش

ہم یہاں طوطیِ ہند حضرت امیر خسرو کے شہرہ آفاق شاہکار "قصّہ چہار درویش" یا اسکے اردو ترجمے "باغ و بہار"-پر اظہار خیال کی جرأت نہیں کر رہے ہیں۔ بچپن میں ہم نے یہ لازوال ادبی شاہکار پڑھے تھے مگر ان پر ہمارا کوئی تبصرہ کرنا اردو کے محاورے چھوٹا منہ اور بڑی بات کی مثال ہوگا۔ ہمیں تو یہاں ان چار درویشان اردو کا ذکر مقصود ہے جنکی جگری دوستی گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں مشرقی یوپی کے ایک چھوٹے سے شہر میں ابتدائی تعلیم کے زمانے میں شروع ہوئی تھی۔ بچپن سے ہی مادری زبان اردو کے عشق میں گرفتار ان چار یاروں میں سے ایک تو ہم خود تھے جسے آگے چل کر علم قانون میں درس و تدریس اور کتابیں پڑھنے لکھنے میں زندگی بتانی تھی اور باقی تین وہ جن کیلئے کاتب تقدیر نے مستقبل میں اردو کے سخنوران کامل کی فہرست میں نام درج کروانا مقسوم کر رکھا تھا۔

طاہر محمود

قدرت نے ہمیں باضابطہ شاعر نہ بنا کر پتہ نہیں رحم فرمایا کہ ظلم لیکن شعر و شاعری سے گہری دلچسپی اور ٹوٹے پھوٹے اشعار کہہ لینے کی صلاحیت عہد طفلی میں ہی بخش دی تھی۔ ہمارے بزرگوں کا آبائی تعلق تو ضلع رائے بریلی کے مردم خیز خطے جائس سے تھا مگر فکر معاش میں اودھ کے شہر بہرائچ میں جا بسے تھے۔ خود ہم نے آنکھیں تو لکھنؤ میں رہائش پذیر اپنے نانا خان بہادر سیّد احسان عظیم مرحوم و مغفور کے کاشانے میں کھولی تھیں جو صوبائی حکومت میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے مگر بچپن بہرائچ میں سخن فہم اور سخن نواز والدین کے سایہ عاطفت میں گزرا تھا۔ پدر بزرگوار مرحوم سیّد محمود حسن شہر کے ایک نامور وکیل تھے اور انکے منشی جی سیّد ریاست حسین شوق بہرائچی وہاں کے ایک مقبول عام ظرافت نگار۔ چنانچہ ادبیات میں گہری دلچسپی اور نثر و نظم میں طبع آزمائی کیلئے ماحول انتہائی سازگار ملا۔ باقاعدہ شعر گوئی کی ابتدا تقریباً تیرہ سال کی عمر میں ہوئی جب ہمیں جنم دینے والی ہستی کو خالق کائنات نے اچانک اپنے پاس بلا کر ہماری روح کو جھنجھوڑ دیا اور ہم نے اس المیے پر ایک بچکانہ نظم کہی۔ نصف صدی بعد دہلی میں ہمارے بزرگ دوست مرحوم رفعت سروش نے اس پرانی نظم کے حوالے سے اپنے ایک اخباری مضمون میں لکھا تھا کہ " اس عمر میں ایسے بلیغ شعر کہنے والا یہ طفل مکتب اگر کوچہ قانون کی طرف نہ نکل گیا ہوتا تو آج اسکا شمار نامور شعراء میں ہوتا"۔ بہرحال بچپن میں ہماری شعر گوئی کو جلا اپنے ان تین جگری دوستوں اور ہم مکتبوں کے ذوق شعری سے بھی ملی تھی جو آگے چل کر دنیائے سخن

میں ساغر مہدی، شاعر جمالی اور اظہار وارثی کے ناموں سے معروف و مقبول ہوئے تھے اور آج دنیا میں نہیں ہیں۔ ذہن و دل کے دریچوں میں محفوظ انکی کچھ یادیں ہم قارئین کی نذر کر رہے ہیں کیونکہ ہمارے بعد بچپن سے دم آخر تک انھیں قریب سے جاننے والا کوئی انکی کہانی سنانے کو باقی نہ بچے گا۔

سید ساغر مہدی

سید ساغر مہدی بہرائچ میں اہل تشیع کی مشہور بستی سید واڑہ میں رہتے تھے۔ کم عمری میں والدین کی شفقت سے محروم ہو کر وہ اور بڑے بھائی اصغر مہدی اپنے ماموں سید ہدایت حسین زیدی وکیل کے زیر عاطفت تھے جو برسوں پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہمارے والد مرحوم کے ہم جماعت رہ چکے تھے اور دونوں خاندانوں میں خاصی قربت تھی۔ ساغر ہم سے تقریباً پانچ سال بڑے تھے مگر تعلقات ہم لوگوں کے دوستانہ تھے۔ ایک دفعہ ایک ساتھی نے جنکے ناخن بڑھے ہوئے تھے ہمارا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم نے فی البدیہ مصرع پڑھا کہ "آپ نے خنجر خونخوار سے انگلی چھولی" تو ساغر نے اس پر فوراً مصرع ثانی لگایا "فصد اس ہاتھ کی حد درجہ ستم سے کھولی"۔ ساغر کے بھائی اصغر بچپن ہی میں پاکستان چلے گئے تھے اور بعد میں نظمی کے قلمی نام سے شعر گوئی کرنے لگے تھے۔ پھر شفیق ماموں ایک دن دیوانی کچہری میں بیٹھے بیٹھے اچانک واصل بحق ہو گئے تو وہ بالکل اکیلے رہ گئے اور اپنائیت کی جستجو میں ہمارے خاندان سے اور زیادہ قریب ہو گئے۔ ایک عرصے بعد جبکہ ہم تو تلاش علم میں ترک وطن کر چکے تھے ساغر نے شہر کے آزاد کالج میں مصروف تعلیم ہو کر ایک نوجوان شاعر کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں خاصا مقام بنالیا۔ ہمارے والد مرحوم آزاد کالج کے ناظم اعلیٰ اور وہاں کے پرنسپل محمد سعید شفیق بریلوی اردو کے کہنہ مشق شاعر تھے، دونوں نے ہی انکی بہت ہمت افزائی کی۔ سعید صاحب بعد میں جونپور کے محمد حسین مسلم کالج کے پرنسپل بن کر وہاں پہونچے تو ہم وہاں کے ایک کالج میں قانون کے نووارد لکچرر تھے اور وہ ایک عرصہ ہمارے مہمان رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں ساغر کا ایک شعر سنایا تھا جو انھوں نے بہرائچ میں انکی الوداعی تقریب میں پڑھا تھا:

نہ روک پائے آپ کو یہ واقعہ عجیب ہے
مری غریب درسگاہ کس قدر غریب ہے

دسمبر ۱۹۷۵ء میں جبکہ ہم لندن میں قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے غریب پرور شہر دہلی میں آبسے تھے ہمارے والد محترم نے مکّہ معظّمہ میں اللّٰھم لبّیک کی صدائیں بلند کرنے والے حجّاج کرام کے ساتھ فریضہ حج ادا کیا اور اسکے معاً بعد "جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے" پر عمل کرتے ہوئے وہیں داعی اجل کو بھی لبیک کہہ دیا۔ اس حادثہ جانکاہ پر عنادل خانہ کے ساتھ مل کے آہ و زاریاں کرنے ہم وطن پدری پہونچے تو ساغر بھی شریک غم ہونے آئے اور ایک مشہور شعر میں کچھ تبدیلی کرکے اس طرح پڑھا:

نہ اب بزرگ نہ ناصح نہ غمگسار کوئی
کسی کے ساتھ گئیں آشنائیاں کیا کیا

اس سانحے کے ٹھیک پانچ سال بعد دسمبر ۱۹۸۰ء میں ساغر صرف ۴۴ سال کی عمر میں فردوس میں اپنے اور ہمارے بزرگوں سے جا ملے۔ انکا پہلا مجموعہ کلام ''دیوانجلی'' کے عنوان سے غالباً ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا جس میں انکی بہت سی نظمیں شامل تھیں اور سرورق پر لکھا تھا ''زخمی شبدوں کی کتاب زخمی روحوں کے نام''۔ غزلوں پر مشتمل دوسرا مجموعہ انھوں نے ''حرف جاں'' کے نام سے ترتیب دیا تھا مگر جہاں تک ہمیں یاد ہے اسکی اشاعت انکی وفات کے بعد ہو سکی تھی۔ ساغر اردو اخبارات میں برابر مضامین بھی لکھتے تھے جنکا ایک مجموعہ 'تحریر و تحلیل'' کے نام سے چھپا تھا، مگر اب تو انکی یہ سب تخلیقات نقش و نگار طاق نسیاں ہو چکی ہیں۔

شاعر جمالی

بہرائچ میں ہمارے ابا جان کی کوٹھی کے عقب میں سڑک کے دوسری طرف ایک اور وسیع و عریض کوٹھی تھی جس کے مالک جناب فیض الحسن شہر کے ایک نامی گرامی وکیل تھے۔ ابا جان نے علی گڑھ سے وکالت کی ڈگری لے کر واپس آنے پر عدالتی نظام کی لازمی تربیت کیلئے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔ انکے بڑے بیٹے منظور حسن بھی وکیل تھے جو ابا جان سے قدرے سینیر تھے۔ منظور صاحب کے بیٹے مظہر حسن پہلے بھوپال کے کسی ادارے میں پڑھاتے تھے بعد میں بہرائچ آکر وکالت کرنے کا فیصلہ کیا تو ابا جان نے انھیں اپنے زیر تربیت لے کر اپنے استاد کا قرض اتار دیا۔ اس طور پر اس خاندان سے بھی ہم لوگوں کا پشت در پشت تعلّق تھا۔ فیض الحسن صاحب کی کوٹھی کے عقبی صحن کے ایک کونے میں واقع ایک چھوٹے سے بوسیدہ مکان میں ایک کنبہ رہتا تھا۔ اس خاندان کا اکلوتا خوبرو اور خوش گلو بیٹا بچپن میں ہمارا ہمدم و دمساز تھا اور دونوں خالی اوقات میں شعر و شاعری کرنے اور ترنّم سے اساتذہ کی غزلیں سنانے میں مصروف رہتے تھے۔ نام تو اسکا سید نذر الحسنین تھا مگر اپنی عرفیت پاشا کے نام سے معروف تھا۔ تعلیم مکمّل کر کے اس نے سرکاری ملیریا ڈپارٹمنٹ کے مقامی دفتر میں ملازمت اختیار کی۔ آنے والے سالوں میں ترقّی ملی اور آخر میں شیراز ہند جونپور پہونچا جہاں سے ہم نے بھی کچھ سال پہلے اپنے تدریسی سفر کا آغاز کیا تھا۔ کچھ عرصے بعد جبکہ ہم دہلی میں مقیم تھے اس نے ایک خط میں ہمیں لکھا کہ ''یہاں مجھے ایک لڑکی سے ضرورت ہو گئی ہے عشق وشق کا معاملہ نہیں ہے شادی کا ارادہ ہے اس لئے ضرورت لکھا ہے'' اور پھر کچھ دنوں بعد رشتہ ازدواج میں بندھ کر جونپور ہی کا ہو رہا۔ نئے لب و لہجے کے ایک نوجوان شاعر کی حیثیت سے خاصی شہرت ملی اور قدردانوں نے ''میر صاحب'' کا لقب دیا۔ پہچانا آپ نے ان میر صاحب قبلہ و کعبہ کو؟ بچپن میں پاشا کے نام سے معروف یہ وہی ہمارے عزیز دوست تھے جنھیں آگے چل کر دنیائے سخن میں ''شاعر جمالی'' کے قلمی نام سے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ لفظ ''جمالی'' کی وجہ تسمیہ ہمیں صحیح تو نہیں معلوم لیکن شاید یہ بہرائچ کے ایک کہنہ مشق شاعر بابا جمال سے نسبت تلمیذ کا مظہر تھا۔
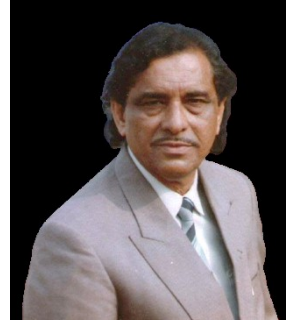
اکتوبر ۲۰۰۸ء کی ۱۹ر تاریخ شاعر جمالی کیلئے اچانک پیغام اجل لے کر آئی اور ''مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور'' کا منظر نامہ دکھا گئی۔ جونپور سے بہرائچ جاتے ہوئے راستے میں فیض آباد ریلوے اسٹیشن پر دل کا سخت دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہیں ہو سکے۔ انھوں نے ایک بار انسانی زندگی کی تلخ حقیقت اپنے ایک شعر میں یوں بیان کی تھی:

شام ڈھلے ہر پنچھی کو گھر جانا پڑتا ہے
کون خوشی سے مرتا ہے مرجانا پڑتا ہے

آسمان شعر و ادب میں بڑی سرعت سے چھلانگ لگانے والا یہ تیز رو پنچھی اس دن خود اپنے اس شعر کا مصداق بن کر لقمہ اجل ہو گیا جبکہ اسکی شام تو ابھی پوری طرح ڈھلی بھی نہیں تھی۔ تدفین کیلئے جسد خاکی بہرائچ لے جایا گیا، گویا ''پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا'' اور قصبہ نانپارہ کے ایک قدیم قبرستان میں ابدی نیند سلا دیا گیا۔ ان سے ہماری مراسلت کم ہوتے ہوتے بالآخر منقطع ہو چکی تھی جس میں ہم دونوں کی بے انتہا مشغولیت کو دخل تھا۔ اخبار میں اس روح فرسا سانحے کی خبر پڑھ کر کئی دنوں تک ہماری کیفیت ''پھر وں تو مزاج دل ناداں نہیں ملتا'' کی رہی۔ ہمیں انکے پسماندگان کا کچھ اتہ پتہ نہیں تھا کہ تعزیت پیش کرتے لیکن تعزیت کے مستحق تو ہم خود بھی تھے اسی پر اکتفا کر لی۔ کئی سال بعد ایک دن سعودی عرب سے ظفر الحسنین نامی ایک صاحب نے ہمیں فون کیا اور بتایا کہ وہ بچپن کے ہمارے اس یار غار کے بیٹے ہیں، وہاں ملازمت کرتے ہیں اور خود بھی شعر کہتے ہیں۔ انھوں نے فیس بک پر ہماری تصویریں اور تحریریں دیکھ کر ازراہ سعادتمندی ہمیں ڈھونڈ نکالا تھا۔ بھولے بسرے تعلّق کی تجدید ہوئی اور اکثر رات گئے فون پر بات چیت ہونے لگی۔

شاعر جمالی منفرد لب و لہجے کے مقبول عوام شاعر تھے جنکی غزلیں اخبارات و رسائل میں برابر چھپتی رہتی تھیں۔ سو سے زائد غزلوں پر مشتمل ایک مجموعہ ''صحیفہ'' کے عنوان سے شاید ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا جسکے سرورق پر یہ شعر تحریر تھا ''مجھ کو تاریخ میں محفوظ کیا جائے گا، میں صحیفہ ہوں کوئی روز کا اخبار نہیں۔'' اس اسم بامسمیٰ شاعر کے پاس مسحور کن اشعار کا ایک بھرا پرا خزانہ تھا مگر جس شعر نے انھیں شہرت عام بخشی وہ یہ معنی خیز شعر تھا:

تم آسماں کی بلندی سے جلد لوٹ آنا
ہمیں زمیں کے مسائل پہ بات کرنی ہے

آئیے اب بچپن کے ان چار درویشان اردو کے چوتھے رکن کی سر گزشت سنئے۔ بہرائچ کے صدر بازار کے عقب میں برہمنی پورہ نامی ایک گنجان محلے میں اظہر وارثی نام کے ایک بزرگ رہتے تھے جنھوں نے اپنے والد حکیم صفدر وارثی مرحوم کی گدی سنبھال رکھی تھی، مطب بھی کرتے تھے اور شاعری بھی۔ انکے ہونہار بیٹے اظہار وارثی عمر میں ہم سے تھوڑے سے بڑے اور اسکول میں ہم جماعت

اظہار وارثی

تھے۔ ہم دونوں اکثر موقعے کی مناسبت سے اساتذہ کا کلام برملا پڑھا کرتے تھے۔ آگے چل کر ساغر مہدی نے دنیا چھوڑی اور شاعر جمالی نے بہرائچ شہر، لیکن میاں اظہار وہیں ڈٹے رہے اور برابر ہمارے ربط میں رہے۔ ایک بار انھوں نے بڑے جذباتی انداز میں ہم دونوں کے زندگی بھر کے ساتھ کا نقشہ ایک طویل نظم میں اس طرح کھینچا تھا:

دو ہم نفس وہ اور میں، میں اور وہ، بچپن کے دن
آدھی صدی کی دوستی کا عہد زریں
روز کا ملنا بچھڑنا ساتھ پڑھنا ساتھ لکھنا
اور اب کچھ بھی نہیں یادوں کی خوشبو کے سوا
آج اسکے زیرپا دنیا کا نقشہ اور میرے سر پہ ان رستوں کی دھول
جن پر بنا کرتے تھے میرے اور اسکے نقش پا شانہ بہ شانہ
اب کہاں وہ میں کہاں محدود میری شخصیت اس کا تشخّص بیکراں
دو چار برسوں میں اس سرزمیں کی طرف
جسکی ہوا میں ہم نے پہلی سانس لی تھی
راہ اسکی رخ بدلتی ہے تو آملتا ہے وہ
اس کا خلوص معتبر زندہ رہا ہر دور میں
جب بھی ملا مجھ کو لگا میرا ہے وہ، اس کا ہوں میں

گزشتہ صدی کے اواخر میں جب وزیر اعظم وقت ایچ ڈی دیوگوڑا کی حکومت نے دہلی میں قومی اقلیتی کمیشن کی سربراہی بالکل غیر متوقع طور پر ہمیں تفویض کی تو یہ بار گراں اٹھانے کیلئے ملک بھر سے قدردانوں نے خیر سگالی اور نیک خواہشات کے پیغامات بھیجے۔ اس موقعے پر ہمارے عزیز دوست اظہار وارثی نے جن جذبات کا اظہار کیا تھا انھیں بعد میں ہم نے اپنی ایک کتاب میں محفوظ کر لیا تھا۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

اے ہم نفس اے عہد رفتہ کے شریک معتبر
ذہن کی پرتوں میں اب بھی تہہ بہ تہہ محفوظ ہیں
تیری رفاقت کے درخشندہ نقوش تیری رفاقت کو سلام
اے صاحب ادراک اے ذی فہم اے اہل شعور
آسماں چھونے کو ہے قد آوران ملک و ملّت میں تری قد آوری

تیرا تشخّص آئینہ در آئینہ جلوہ نما، سوچیں تری تزئین کار عہد نو

نظریں تری بارک بین و دور رس

تیرا قلم قانون کا عقدہ کشا، مرحبا صد مرحبا

اظہار وارثی کا پورا کلام ہم نے پڑھا ہے، بار بار پڑھا ہے اور انکی خیال آفرینی کو دل سے سراہا ہے۔ انکے درج ذیل اشعار نے جو انھوں نے علّامہ اقبال کے مشہور زمانہ شعر "باغ بہشت سے مجھے حکم سفر ہوا تھا کیوں، کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر" کے حوالے سے لکھے تھے ہمیں بے حد متاثر کیا تھا:

کسی سے تم اذن سفر لے کے آئے ہو

کار جہاں کی درازی کو یکسر بھلا کر

نئے دیس میں صرف سانسیں گنوا کر کہاں تک رہو گے

تمہیں اپنے ہونے کی توثیق کرنے کی خاطر

زمیں کی تہوں میں اترنا بھی ہے

آسمانوں کو مٹھی میں بھرنا بھی ہے

اس سے پہلے کہ گھر سے کوئی آکے کہہ دے چلو گھر چلو

زندگی کے مختلف ادوار میں اظہار وارثی نے اپنے مختلف الاصناف کلام کے تین مختصر مجموعے شائع کروائے تھے جن میں "کبوتر سبز گنبد کے" حمد و نعت پر مشتمل ہے، "کشت خیال" میں غزلیں اور نظمیں وغیرہ شامل ہیں اور "سوچ کی آنچ" میں ثلاثی، ماہیے اور دوہے۔ اب سے کئی سال پہلے جبکہ وہ متعدد بیماریوں میں مبتلا ہو چکے تھے انھوں نے ایک دن فون پر ہمیں بتایا کہ انکا باقی ماندہ کلام "شب تنہائی کا چاند" کے عنوان سے مرتب کیا گیا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے "رسوخ" کا استعمال کر کے اسکی اشاعت کیلئے کسی ادارے سے مالی اعانت کا انتظام کر دادیں۔ اب رسوخ و سوخ ہمارے پاس کہاں دھرے تھے، مسودہ منگوا کے خاموشی سے ایڈیٹ کیا، پیش لفظ لکھا اور اپنی طرف سے چھپوا دیا کہ شائد اس طرح نصف صدی سے زائد کی دوستی کا حق کسی قدر ادا ہو جائے۔ کتاب کے نسخے پہونچے تو بے انتہا خوشی کا اظہار کیا اور ہمیں لکھا کہ اسکی بدولت بیماری کی شدت میں قدرے کمی آنے لگی ہے۔ لیکن انکی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی اور چند ماہ بعد ہی پرانے عارضوں نے مزید ترقّی کر کے انھیں صاحب فراش کر دیا مگر پھر بھی ان سے ہر ہفتے فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن چند روز کے بیرونی سفر سے واپس آ کر ہم نے فون کیا تو نقاہت بھری آواز میں بولے کہ "ہمارا آخری سلام لے لو آئندہ شاید ہم بات کرنے کے قابل نہ رہیں"۔ اسکے دو ہفتے بعد ۲۱/اگست ۲۰۱۸ء کو اظہار میاں چل دئیے، وہاں جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔

ہمارا قصّہ چہار درویش تو ختم ہوا لیکن ہم ابھی اظہار وارثی کے بعد بچھڑنے والے اپنے ایک اور عزیز دوست کا مختصر تذکرہ کرنا چاہیں گے جنھوں نے ہمارے اس قصّہ پارینہ کا شروع سے آخر تک ہر قدم پر قریبی مشاہدہ کیا تھا۔ یہ تھے ہمارے حقیقی بھائی خالد محمود، عمر میں دو سال چھوٹے، تعلقات میں بھائی کم دوست زیادہ، ہماری ہی طرح شعر و ادب کے دلداہ، اور بہرائچ کے گورنمنٹ اسکول سے لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک ہمارے ہم پیالہ و ہم نوالہ۔ علی گڑھ سے نباتیات میں ڈگری لے کر ضلع بہرائچ سے متصل ریاست نیپال کے شہر نیپال گنج کے ایک کالج میں پڑھانا شروع کیا۔ لیکن اردو کی چاشنی تو انکی بھی گھٹّی میں ملی ہوئی تھی، ایک خشک سائنسی مضمون میں تدریسی مشغولیت اس پر بھلا کیسے غالب آسکتی تھی۔ چنانچہ اخبارات میں لکھنا شروع کیا، مضامین کا ایک مجموعہ ”نثری کاوش“ کے عنوان سے ملک زادہ منظور احمد مرحوم و مغفور کے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا اور جلد ہی شہر کی ادبی محفلوں کی روح رواں بن گئے۔

اب سے کئی سال پہلے خالد میاں انسان کو اندر سے آہستہ آہستہ گھلا کے رکھ دینے والے ایک موذی مرض میں مبتلا ہوئے اور کئی سال سخت جسمانی و دماغی تکلیف جھیل کر بالآخر ۱۷/ دسمبر ۲۰۱۸ء کو لکھنؤ کے ایک اسپتال میں زندگی کی جنگ ہار گئے۔ ہم سنگاپور کے سفر پر تھے، حالت نازک ہونے کی خبر پا کر بھاگم بھاگ دہلی کے راستے لکھنؤ پہونچے لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ جسد خاکی کو تدفین کیلئے بہرائچ لے جایا گیا اور والدہ مرحومہ کے جوار میں ابدی نیند سلا دیا گیا۔ قبرستان میں ہماری آنکھوں میں ۶۵/ سال پہلے کا وہ المناک منظر گھوم گیا جب ہم نے اپنے چھوٹے چھوٹے کمزور ہاتھوں سے ٹھیک اسی جگہ اپنی جان چھڑکنے والی ماں کی قبر پر مٹّی ڈالی تھی۔ دل کی دھڑکن کی رفتار خطرناک حد تک بڑھی ہونے کی کیفیت میں ہم نے اب ایک زندگی بھر کی برادرانہ اور دوستانہ رفاقت کو بھی وہیں زمین کی گہری تہوں میں گم ہوتے دیکھا اور ایک بار پھر جناب منوّر رانا کا یہ مبنی بر حقیقت شعر دل ہی دل میں دہراتے رہے:

ہم کو معلوم ہے شہرت کی بلندی ہم نے
قبر کی مٹّی کو دیکھا ہے برابر ہوتے

بیادگار حضرت مولانا محمد احسان الحق قدس سرہ العزیز

مہتمم اول جامعہ مسعودیہ نورالعلوم بہرائچ

الاحسان اکیڈمی، بہرائچ

الاحسان اکیڈمی، بہرائچ ایک تحقیقی و تصنیفی ادارہ ہے۔ جس کے اغراض و مقاصد یہ ہیں۔

۱۔ نسل کو اکابر و شخصیات بہرائچ سے متعارف کرانا۔

۲۔ شخصیات بہرائچ کی سوانح حیات پر علمی و تحقیقی کام انجام دینا۔

۳۔ اہم علمی نوادرات، مختلف موضوعات پر اکابر (خصوصاً اکابرین بہرائچ) کے ذریعے لکھی گئی قدیم کتب کی جدید اشاعت کرنا۔

۴۔ اکابر کی اہم علمی و تحقیقی کتابوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرانا۔

نوٹ

اکیڈمی اپنی خدمات،اور سرگرمیاں انٹرنیٹ کی وساطت سے متعارف کرانے کا بھی نظم کرے گی۔

https://t.me/alehsaanbahraich